نام کا کلمہ پڑھتی تھی۔ قلعہ معلیٰ کے شہزادے شہزادیاں الگ ان کی گرویدہ تھیں۔ اے صاحبو ان کی شہرت تو جنات تک میں پہنچی ہوئی تھی۔ یہ بات میں اپنے مغز سے اُتار کر نہیں کہتا' اماں جانی کی کہی دہراتا ہوں۔ ایک دن میں نے اس اجمال کی تفصیل پوچھی تو اماں جانی نے یوں بیان کیا کہ بیٹے ایسا ہوا کہ ایک روز شام پڑے ایک اجنبی مطب میں آیا اور گڑگڑا کر کہنے لگا کہ مریض آخری دموں پہ ہے۔ اپنی مسیحائی سے اسے بچا لیجئے۔ تمہارے پردادا کے دل پہ اس کے گڑگڑانے کا بہت اثر ہوا۔ جیسے بیٹھے تھے ویسے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے اور اجنبی کی لائی ہوئی سکھپال میں جا بیٹھے۔ تھوڑی دور چلے ہوں گے کہ اے لو یہ تو گھنی بنی آ گئی۔ رات کا سناٹا۔ دور دور تک آدمی نہ آدم زاد، شیروں کی دہاڑ، ہاتھیوں کی چنگھاڑ، تمہارے پردادا نے تشویش سے باہر نظر دوڑائی۔ اجنبی سے کہا کہ میرے عزیز تم ہمیں کہاں کالے کوسوں لے آئے۔ منزل کتنی دور ہے۔ اجنبی نے مڑ کر نظر ڈالی تو تمہارے پردادا نے کیا دیکھا کہ اس کی صورت تو بکرے والی ہے۔ بہت حیران ہوئے کہ وہ آدمی کون تھا، یہ جناور کون ہے۔ یہ سوچتے تھے کہ سکھپال ایک بڑے سے پھاٹک میں داخل ہو گئی۔ سکھپال سے اُترے۔ دیوان خانے میں گئے۔ مریض پھپر کھٹ پہ چادر تانے لیٹا تھا۔ چادر اُٹھی تو حق دق رہ گئے۔ چہرہ مورکا، ٹانگیں ہرن کی سمجھ گئے کہ یہ غیر مخلوق ہے۔ اصل میں وہ جنوں کا شہزادہ تھا۔ تمہارے پردادا نے سکون کے ساتھ اس کی نبض دیکھی، پیشانی کو چھوا۔ تیمارداروں سے کہا کہ شیر ببر کے اگلے پنجہ کا ناخن مہیا ہو جائے تو مریض شاید بچ جائے ورنہ رات رات کا مہمان ہے۔ ایک لمبا تڑنگا جن اُٹھا اور غائب۔ پھر دم کے دم میں حاضر۔ شیر کا ناخن لا کر پیش کر دیا۔ تازہ تازہ خون لگا ہوا جیسے ابھی زندہ شیر کے پنجے سے کھینچا ہو۔ تمہارے پردادا نے ناخن کو پتھر پہ گھسا، شہد میں گھولا اور مریض کو چٹا دیا۔ اے لو مریض نے آنکھیں کھول دیں۔ ادھر مریض پریشان گھر والے حیران کہ حکیم صاحب کہاں گئے۔ اے لو چوتھے دن

ہشاش بشاش چلے آرہے ہیں۔ ساتھ میں گدھوں پہ لدی ہوئی مشکیاں۔ ہر مشکی اشرفیوں سے لبالب بھری ہوئی۔ اِدھر مشکیاں اتاری گئیں اُدھر گدھے غائب۔ پھر تو بیٹے جنوں کو مساوات پڑ گئی۔ جس کی طبیعت خراب ہوتی آکر نبض دکھاتا، دوا لیتا اور سونے کی ڈلی نذر کر جاتا ارے جبھی تو تمہارے پردادا کے گھر میں انگاروں پیسہ تھا۔ ایسی حویلی بنائی تھی کہ کیا راجوں مہاراجوں کے محل ہوں گے۔ محل تو تھا ہی۔ گلستان محل سچ مچ گلستان محل تھا۔ مگر سب کچھ غدر میں غارت ہو گیا۔

عزیزو، غدر میں غارت ہونے کی صورت یہ ہوئی کہ ابا جانی کے تایا حضور مولوی عبدالخالق علی نے کہ اپنے وقت کے صاحب ضمیر عالم دین تھے۔ فرنگیوں کے خلاف جاری ہونے والے جہاد کے فتوے پر دستخط کر دیئے تھے۔ جب لڑائی کا پانسہ پلٹا تو شریفوں روشن ضمیروں کی شامت آئی۔ بڑے تایا حضور پھانسی پر چڑھ گئے۔ دادا جانی حکیم گل زباغ علی خاندان کو سمیٹ راتوں رات کے پردے میں اس آفت زدہ شہر سے نکل گئے۔

دادا جانی اہلِ خاندان سمیت خاک بسر بے گھر بے در پھرتے پھرے۔ مگر برن کے علاقہ سے گذرتے گذرتے پکڑے گئے۔ اس اجاڑ قریئے نے جواب ہمارا مسکن ہے۔ دادا جانی کے قدم پکڑ لئے۔ بس وہیں ڈیرے ڈال دیئے۔ ابا جانی بیان کیا کرتے تھے کہ ان دنوں یہ بستی اجاڑ ویران تھی۔ مٹھی بھر اہلِ ہنود۔ جہاں تہاں مسلمانوں کے گھر باقی اشجار بے شمار تھے۔ مگر ان میں کوئی قرینہ نہیں تھا۔ نرا جنگل تھا۔ نہ امرتیاں نہ کوئی پھولتا مہکتا باغ۔ بس جھڑ بیری کے بیر پنیریوں کے حساب سے سمیٹ لو۔ آم بھی تھے مگر کاٹھا آم۔ قلمی آم کہ تراش کر سلیقہ سے کھایا جا سکے ناپید تھا۔ بازار میں گڑ کی بھیلیاں بہت دکھائی دیتی تھیں۔ قند و نبات کی شیرینی سے یہ قریہ ناآشنا تھا۔ قند غائب شکر قند بہت، سواری کے نام نہ نالکی نہ پالکی نہ ڈولی۔ چھکڑے چلتے تھے۔ کبھی کوئی رتھ دکھائی دے جاتا تو عورتیں گھروں کی ڈیوڑھی پر آ آ کر تعجب سے دیکھتیں کہ رتھ جا رہا ہے۔ ہاتھی

پوری بستی میں ایک تھا کسی ہندو ساہوکار کا جب پوکھر پہ نہانے کے لئے نکلتا تو بستی کے بچوں کی عید ہو جاتی۔

دادا جانی نے یہ سارا نقشہ دیکھا لیکن ذرا جو بے دماغ ہوئے ہوں۔ ڈیرا ایک دفعہ ڈال لیا تو بس ڈال لیا۔ پھر وہ اس دیار میں جم کر بیٹھے۔ مٹھی میں ہنر تھا۔ ہاتھ میں شفا تھی۔ مریض جنم جنم کے روگ لے کر آتے تھے اور شفا کی سند لے کر جاتے تھے۔ ان کی مسیحائی کی خبر دور و نزدیک ایسے پھیلی جیسے خوشبو پھیلتی ہے۔ بس اسی کے ساتھ اُسے بستی کا نقشہ بھی بدلنے لگا۔ دادا جانی کی بگھی آئی تو بستی میں گویا ایک انقلاب آیا۔ یہ سواری یہاں کی خلقت نے پہلے بھلکا ہے کو دیکھی تھی۔ سب کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں جاننا چاہیئے کہ جب کسی بستی میں کوئی نئی سواری آتی ہے تو اس کے ساتھ ہی بستی کا طور بدل جاتا ہے۔ تو بس ہمارے دادا جانی کی بگھی کے ساتھ اس دیار کی کایا پلٹ ہوگئی۔

برن کے پورے علاقہ میں چرچا تھا کہ اس نواح میں ایک مسیحا نفس طبیب آیا ہوا ہے۔ ہوتے ہوتے یہ خبر حاکم ضلع کی میم صاحب تک پہنچی۔ میم صاحب کا حال بہت پتلا تھا۔ حمل ٹھہرتا تھا مگر ساتویں مہینے کے آتے آتے ضائع ہو جاتا تھا۔ ڈاکٹروں سے بہت علاج کرایا۔ مگر اس بی بی کے مقدر میں تو شفا کہیں اور لکھی تھی۔ دادا جانی کو طلب کیا گیا۔ دادا جانی تین مہینے تک میم صاحب کو خمیرے معجونیں چٹاتے رہے۔ بعد اس کے گذارش کی کہ میم صاحب اب آپ بصد شوق کلکٹر بہادر دام اقبالہٗ کے پاس جائیں۔ حمل ٹھہرنا شرط ہے۔ گر جائے تو میرا ذمہ بیشک ہرنی کی طرح کودتی پھاندتی پھریئے۔ اندر والے کے لئے کوئی جوکھوں نہیں ہے۔

دادا جانی نے جیسا فرمایا تھا ویسا ہی ہوا۔ گلگوتھنا سا لال پیدا ہوا۔ میم صاحب بہت مسرور ہوئیں پوچھا ویل حکیم شاب کیا فیس مانگتا ہے۔ دادا جانی نے بصد ادب عرض کیا کہ فرزند دلبند آپ کو مبارک ہو۔ یہ عاجز صرف نظر کرم چاہتا ہے۔ پھر احوال

خاندان کے عتاب میں آنے کا گوش گذار کیا۔ میم صاحب نے شوہر نامدار کے کان میں بات ڈالی۔ کلکٹر بہادر دام اقبالہٗ نے اپنے حاکمانہ و فرنگیانہ اثر و رسوخ کو استعمال میں لاکر معافی تلافی کروائی۔ ادھر ملکہ معظمہ کی طرف بھی عام معافی کا اعلان ہو گیا خلقت کو ملکہ کے لطف و کرم نے لوٹ لیا۔ دادا جانی اس نیک نہاد ملکہ کے اخلاقِ حمیدہ سے اتنے متاثر ہوئے کہ مدح میں اس جناب کے ایک قصیدہ رقم کیا اور کلکٹر بہادر کی خدمت بابرکت میں بھجوایا۔ اس جانب سے توقع سے بڑھ کر قدر دانی ہوئی اور انعام و اکرام کی بارش ہوئی۔ حاذق الملک کا خطاب عطا ہوا۔ المختصر ادبار کے دن ٹل گئے، عتاب کے بادل چھٹ گئے۔ ہمارا خاندان سلطنت انگلیسیہ کی نظروں میں سرخرو ہوا۔ پھر خوش حالی کے دن آ گئے۔ دادا جانی اب اس دیار میں رچ بس گئے حویلی کی تعمیر کی۔ جب حویلی بن کر کھڑی ہوئی اور نام اور تاریخ تعمیر کا پتھر لگانے کا وقت آیا تو ابا جانی کو بلا کر فرمایا کہ فرزند، ہمارا زمانہ جہان آباد تک تھا۔ اب تمہارا زمانہ ہے۔ سنگِ تعمیر تمہارے نام کا لگے گا۔ یوں حویلی کا نام چراغ حویلی رکھا گیا۔

دادا جانی چراغ حویلی کھڑی کر کے خود ڈھیتے چلے گئے۔ دنیا کے قصوں بکھیڑوں سے منہ موڑ کر خانہ نشین ہو گئے۔ جتنے دن جئے گلستان محل کو یاد کر کے گریہ کرتے رہے۔ طب کو بھی سلام کر لیا۔ علاج معالجہ سے منہ موڑ لیا۔ ہر دم ہاتھ میں تسبیح، یادِ خداوندی اب خاندانی مسند پہ ابا جانی حکیم چراغ علی رونق افروز تھے۔ کیا دبدبہ تھا۔ ان کے پیشاب پہ چراغ جلتا۔ تشخیص کی دھوم دور دور تھی۔ ہاتھ میں کچھ تاثیر تھی کہ خاک کی چٹکی بھی مریض کو دے دیتے تو ہفتے پندرہ واڑے میں بھلا چنگا ہو جاتا۔ ڈاکٹروں نے بہت زور مارا مگر ابا جانی کے مقابلہ میں ڈاکٹری کا چراغ نہیں جلا۔

روایت کی ابنِ حاتم نے عبداللہ عمرو بن عاص سے کہ جب سے دنیا عدم سے وجود میں آئی ہے۔ تب سے آغاز میں ہر صدی کے فتنہ کوئی نہ کوئی ضرور بپا ہوا ہے۔ اس بیچ بیچ مداں مشتاق علی یہ بولنے کی جسارت کرتا ہے کہ پھر تو بسم اللہ ہی غلط ہو گئی

آغاز ایسا ہے تو انجام کیسا ہوگا۔ دور کیوں جاؤ بیتی صدی کے دم آخر کی مثال سامنے ہے۔ جب فقیر نے ہوش کی آنکھ کھولی تو صدی دم توڑ رہی تھی اور فتنے دم میں آرہے تھے۔ ایک فتنہ دہریت کا، ایک فتنہ نیچریت کا۔ پھر آگے چل کر ایک ڈھونگ دعویٰ نبوت کا، ایک شگوفہ مہدی موعود کا۔ کوئی فتنہ احاطۂ پنجاب سے اُٹھا، کوئی شگوفہ دیارِ علی گڑھ سے پھوٹا القصہ دنیا فتنوں سے بھری ہوئی تھی اور اسلام خطرے میں تھا۔

ابا جانی نے برادر خورد اشتیاق علی اور اس ہیچ مداں کو یہ خیال کر کے علی گڑھ کالج بھجوا دیا تھا کہ جب فرنگیوں کے راج میں رہنا ہے تو ان کی گٹ پٹ کو بھی سیکھ لیا جائے۔ انہوں نے اپنے طور پر نیکی کی تھی کہ کسی طور اولاد کی دنیا سنبھل جائے۔ یہ کب گمان تھا کہ اشتیاق میاں دنیا کے پیچھے دین کی دولت گنوانے پہ تل جائیں گے۔ علی گڑھ جا کر ان میاں کے پَر نکل آئے۔ اُونچا اُڑنے لگے۔ واپس اس رنگ سے آئے کہ در مدح نیچر رطب اللساں تھے۔ اماں جانی ہرنی کا معجزہ بیان کر رہی تھیں کہ وہ میاں بیچ میں تڑ سے بولے کہ یہ واقعہ تو خلاف نیچر ہے۔ اماں جانی نورِ نظر کا یہ کلام سن کر دم بخود رہ گئیں۔ خیر انہوں نے تو اپنی طرف سے پردہ ڈالنے کی بہت کوشش کی۔ مگر عشق اور مشک کی طرح فتنہ کی بات بھی چھپی نہیں رہتی۔ دیوار کے بھی کان ہوتے ہیں۔ ہونٹوں نکلی کوٹھوں چڑھی۔ دوسرے دن ہر چھوٹے بڑے کی زبان پر تھا کہ حکیم چراغ علی کا بیٹا نیچری ہوگیا۔ اماں جانی نے لاچار ابا جانی کے گوش گذار کیا کہ لاڈلے میاں نیچری ہوگئے ہیں، برادری میں تھڑی تھڑی ہو رہی ہے، جو سنتا ہے دانتوں میں انگلی دباتا ہے۔ ابا جانی نے تامل کیا اور فوراً ہی میاں کو کالج سے اُٹھوا لیا۔ ان میاں نے بہت زاری کی مگر ابا جانی نے دو ٹوک فرمایا کہ فرزند، تمہیں نیچری بنا کر ہمیں اپنی عاقبت خراب کرنی منظور نہیں ہے۔

مگر بڑے خالو نجم الہدیٰ خود امورِ دین سے بے نیاز تھے۔ رنگِ فرنگ میں غرق

تھے۔ فرزند کے بارے میں خبریں سُنیں۔ ہر خبر کو ایک کان سنا، دوسرے کان اُڑایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شمس الہدیٰ علی گڑھ سے نرے دہریہ بن کر نکلے۔ ہماری چھوٹی پھوپھی سے ان کی نسبت ٹھہری ہوئی تھی۔ اب جو اُن کی دہریت کی خبر بد ابا جانی کے کانوں تک پہنچی تو انہیں فکر لاحق ہوئی کہ ہمشیرہ عزیزہ کا ہاتھ ایک دہریئے کے ہاتھ میں کیسے پکڑا دیں۔ آخر الامر بڑے خالو صاحب کو بطرزِ شائستہ کہلا بھیجا کہ یہ دینداروں کا گھرانا ہے، دہریہ داماد کا متحمل نہیں ہو سکتا۔

پھر شادی ہماری چھوٹی پھوپھی کی لکھنؤ کے ایک معزز گھرانے کے چشم و چراغ سے ہوئی کہ اسم گرامی ان کا قنبر حسن تھا کہ اب مرحوم و مغفور ہیں۔ طبیعت شائستہ طینت پاکیزہ پائی تھی۔ تھے بھی تو ماشاءاللہ خانم کے تربیت یافتہ خانم نے بھی ان کی خاندانی شرافت و نجابت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور ان کے والد گرامی فخر الواعظین مولانا شبر حسن سے زمانہ شباب کے تعلقِ خاص کو خاطر میں لاتے ہوئے ان پر توجہ خاص کی تھی۔ مجلسی آداب سکھائے پاکبازی کا سبق پڑھایا۔ خانم کی بیٹیاں واہ واہ سبحان اللہ۔ ایک آفتاب تو دوسری ماہتاب جب پھوپھا حضور اس بالاخانے پہ پہنچے تھے تو دونوں کچی کلیاں تھیں۔ ان کی آنکھوں کے سامنے شگفتہ ہوئیں۔ مہک ان کی چار سو گئی۔ بھونرے اُڑ کر دور دور سے آئے۔ مگر دور ہی دور منڈلائے۔ خانم نے کسی کو قریب نہیں پھٹکنے دیا۔ کیا ٹھسا تھا خانم کا پیشاب یہ اس کے چراغ جلتا تھا۔ محفل کا کیا رکھ رکھاؤ تھا کہ ہم شما کا کیا مذکور۔ نوابوں کا بھی وہاں گذر مشکل سے ہوتا تھا۔ مولانا شبر حسن تو زمانہ شباب میں اہلِ علم کے گھرانے سے نسبت رکھنے کے باعث بار پا گئے تھے۔ مگر بس ذائقہ چکھا اور محفل سے دامن جھاڑ کر اُٹھ لئے پھر ان کا ذہن ہی بدل گیا۔ اس محفل سے اُٹھ محفلِ وعظ میں جا بیٹھے۔ پھر ایسے اس محفل کے ہوئے کہ خود اس راہ پر چل نکلے اور فخر الواعظین کہلائے۔ مگر خانم نے وضعداری کو آخر وقت تک نبھایا۔ ہمارے پھوپھا قنبر حسن ابھی کمسن تھے کہ انہیں اپنے سایۂ عاطفت

میں لے لیا۔ تو اس جناب نے اس بلند بام بالاخانے سے تہذیب سیکھی۔ وہیں تیسوں پارے ان کچی کلیوں کے ساتھ بیٹھ کر ختم کئے۔ عروض سیکھا۔ سُروں کی تعلیم لی۔ چند برسوں ہی میں دھل منجھ گئے۔ خام گئے تھے، ترش کر آئے۔ طبیعت حسن پرست، باطن مثل آئینہ صاف کن رس، شعر شناس سوز خوانی کرتے ہوئے کبھی سُر سے باہر نہیں ہوئے اور لہجہ کی ادائیگی میں کبھی خطا نہیں کی۔ فقیر آج کے سوز خوانوں کو دیکھتا ہے تو خون کے آنسو روتا ہے۔ ارے میاں سوز خوانی ذاکری بنا شد۔ اچھا اچھا خون تھوک جاتا ہے۔ حقیر فقیر یہ کہتا ہے کہ راگ راگنیوں میں درک نہیں تو اس فنِ شریف میں قدم رکھنا کیا ضرور ہے۔ ثواب کمانا مقصود ہے تو وہ تو وعظ دے کر بھی کمایا جا سکتا ہے۔

خیر ذکر تو یہ تھا کہ ایسے تھے ہمارے پھوپھا حضور۔ ہم سب چھوٹی پھوپھی کو چھوٹی پھوپھی ہی کہتے۔ پھوپھا حضور نے بطرز شائستہ ہمیں ٹوکا کہ ایسا کہنا خلاف ادب ہے۔ تب ہم چھوٹی پھوپھی کو پھوپھی حضرت اور چھوٹے پھوپھا کو پھوپھا حضور کہنے لگے۔ واضح ہو کہ ہمارے پھوپھا حضور کے خاندان عالی شان میں زبان و بیان پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ روزمرہ اور محاورے سے انحراف کو ظلم عظیم تصور کیا جاتا تھا۔ مولانا شبر حسن سے کے متعلق یہ روایت مشہور تھی کہ محض زبان کے سوال پر انہوں نے بیٹی کا رشتہ واپس کر دیا تھا۔ سوال ڈال دیا کہ ہم صاحبزادے کو فرزندی میں لینے سے پہلے ان کا امتحان لیں گے۔ امتحان اس طور لیا کہ مثنوی سحرالبیان کھول کر سامنے رکھ دی کہ میاں ذرا پڑھ کر تو سناؤ۔ چار شعر سنے اور کہا کہ بس کرو۔ کہلا بھیجا کہ صاحبزادے اضافت کھاتے ہیں۔ ہماری بیٹیا کا ان کے ساتھ گذارہ کیسے ہوگا۔ ویسے ہماری پھوپھی کا بھی امتحان لیا گیا تھا۔ لکھنؤ سے چل کر ایک بی مغلانی آئیں۔ مثنوی سحرالبیان پڑھوا کر سنی، لب و لہجہ دیکھا، تذکیر و تانیث کے استعمال کو پرکھا۔ ہماری پھوپھی بھی چاروں کھونٹ پکی تھیں۔ بی مغلانی اپنا سا منہ لے کر چلی گئیں۔

پھوپھا حضور اثنا عشری تھے۔ پھوپھی حضرت بھی اس گھر میں جا کر اسی رنگ میں رنگی گئیں۔ محرم کے چاند کے ساتھ چوڑیاں توڑ ڈالیں۔ کنگھی چوٹی موقوف، سرمہ مسی معطل۔ دس دنوں تک سیاہ پوشاک پہننا، الٹی چارپائی پہ سونا۔ ہمارے خاندان میں بڑے پھوپھا صاحب پیر مغیث الدین کے توسط سے کہ پہنچے ہوئے بزرگ تھے تفضیلیت تو پہلے ہی راہ پا گئی تھی۔ اب پھوپھا حضور کی راہ تھوڑا تشیع بھی در آیا۔ خیر میاں شمس الہدیٰ کی دہریت سے تو بچ گئے۔ بس خدا ہی نے بچایا۔ بروقت پتہ چل گیا۔ وہ میاں تو نرے جنٹلمین بن گئے۔ لندن گئے تو وہاں ایک میم سے نکاح بطرز فرنگ پڑھوا لیا۔ پھر جنٹلمری اولاد پیدا کی۔ بیٹی بیٹے آدھے گورے آدھے کالے۔ قدرے مسلمان، زیادہ کرسٹان آدھا تیتر آدھا بٹیر خاندان۔

مدعا کہنے کا یہ ہے کہ ایسے کافر زمانے میں اس عاصی پر معاصی نے شعور کی آنکھ کھولی، مگر بحمداللہ کہ اپنے عقیدے کے شیشے پر بال نہیں آنے دیا۔ ایمان کی کشتی کو دہریت کے گرداب سے اور نیچریت کے تھپیڑوں سے بچا کر صاف نکال لے گیا۔ اس پاک پروردگار کا شکر بجا لاتا ہوں۔ جس نے اس بیچ پوچ میں یہ استقامت پیدا کی کہ ایسے دشمنِ ایمان زمانے میں ایمان کو متزلزل نہیں ہونے دیا۔

ارے نیچریت اور دہریت ایک طرف، اس گنہگار نے تو ناقوس کی آوازوں کے سائے میں ہوش سنبھالا ہے۔ مندر چراغ حویلی سے کتنی دور تھا۔ یہی کوئی فرلانگ ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلہ پر۔ پنڈت گنگادت مہجور کی صحبت اس پر مستزاد کرتب ہی سے ان کے ساتھ دانت کاٹی روٹی چلی آتی ہے۔ ہائے پنڈت کیا ہیرا آدمی ہے۔ ایک دفعہ کلمہ پڑھ لے تو سیدھا جنت میں جائے۔ اُف خدایا، کیسا کیسا غاصب ظالم جابر بے ایمان دغاباز چور اچکا قزاق بٹ مار محض اس زور پر کہ اُمتِ مرحومہ میں شامل ہے جنت پر اپنا حق جتاتا ہے۔ ادھر ہمارے پنڈت مہجور کا دامن نیکیوں سے بھرا ہے۔ مگر کلمہ گو نہ ہونے

کے سبب مقدمہ ان کا کھٹائی میں پڑ گیا ہے۔

میں نے ایک دن کہا کہ "پنڈت، بس ایک دفعہ کلمہ پڑھ لے اور پھر مرجا۔"

"اس سے کیا ہوگا؟"

"پھر تو سیدھا جنت میں جائے گا۔"

پنڈت ہنسا۔ کہنے لگا کہ "شری مشتاق علی، تمہارے یہاں تو جنت میں جانے کا بہت آسان نسخہ ہے۔ زبان سے ایک دفعہ کلمہ پڑھ لیا اور بے کھٹکے سیدھے جنت میں پہنچ گئے۔ ہمارے یاں پہ سورگ کی راہ بہت کٹھن ہے۔ ارجن بھیم نکل سہدیو کیسا کیسا گیانی رستے ہی میں ڈھے گیا۔ انت میں ایک کتا رہ گیا کہ یدھشٹر مہاراج کے سنگ سورگ کی چوکھٹ تک پہنچا۔"

میں نے ٹکڑا لگایا "سبحان اللہ۔ حضرت انسان اشرف المخلوقات بنے پھرتے تھے، وہ تو رہ گئے۔ کتا سورگ تک پہنچ گیا۔"

پنڈت بولا "آدمی کا گھمنڈ اُسے لے بیٹھتا ہے۔ سہدیو کو بدھیمان ہونے کا گھمنڈ تھا۔ نکل کو اپنی سندرتا کا گھمنڈ تھا۔ بھیم کو اپنے کس بل کا گھمنڈ تھا۔ ارجن کو اپنی دھنش اور بان کا مان تھا۔"

"اور دروپدی؟"

"ہاں دروپدی سے بھی اک چوک ہوئی۔ اس نے پانچوں سے برابر کا پریم نہیں کیا۔ ارجن پہ زیادہ ریجھ گئی۔"

اب میرے ہنسنے کی باری تھی۔ "واہ پنڈت واہ۔ اشرف المخلوق کو کس کس بہانے سے کاٹا ہے۔ پوری بنی نوع انسان کو قلمزد کر کے سورگ کا قبالہ ایک کتے کے نام لکھ دیا۔"

پنڈت نے بہت متانت سے کہا "شری مشتاق علی پشو پنچھی۔ نر ناری، دھنی نردھنی سب رام رحیم کی مخلوق ہیں۔ اس سنسار میں نہ کوئی چھوٹا ہے نہ کوئی بڑا ہے۔ نہ کوئی

اُونچی ذات نہ کوئی نیچ ذات"۔

ظالم نے مجھے لاجواب کر دیا۔ خیر آمدم بر سرِ مطلب فقیر یہ عرض کر رہا تھا کہ ایسے پُر آشوب زمانے میں جب چار سو دہریت کی آندھیاں چل رہی تھیں اور نیچریت نے طوفان بو مچا رکھا تھا اس حقیر فقیر نے اپنے ایمان پر آنچ نہیں آنے دی۔ یہ سب ابا جانی اور والدہ ماجدہ کی تربیت کی کرامت ہے اور پھوپھا پیر مغیث الدین کا فیضِ صحبت۔ ہمارے پھوپھا صاحب اپنے وقت میں مرجعِ خاص و عام تھے۔ درماندوں دکھیاروں کے ہمدرد۔ حاجت مندوں کے حاجت روا۔ نامراد خدمت بابرکت میں آتے تھے اور بامراد واپس جاتے تھے۔ ایک روز یہ فقیر خدمت میں حاضر تھا کہ ایک مردِ مفلس آکر ملتجی ہوا کہ گھر میں تین دن سے فاقہ ہے۔ بچوں کے منہ میں کھیل تک نہیں گئی۔ مراد پوری کرو یا زہر دے دو کہ قصہ پاک ہو۔ پھوپھا صاحب نے تامل کیا۔ پھر آبِ صندل سے ایک نقش لکھ کر دیا اس ہدایت کے ساتھ کہ اسے سرہانے پائے تلے دبا دیجیو۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ اثر سے اس کے روز صبح کو چاندی کا ایک روپیہ ملکہ وکٹوریہ کی مورت والا تکیے کے نیچے سے برآمد ہوتا و نیز چاندی کی ایک ڈلی۔ دنوں میں دلدر اس کے دور ہو گئے۔

ایک اور واقعہ نقل کرتا ہوں کہ کیونکر ایک عاشق کو وصالِ صنم میسر آیا۔ خدا کو حاضر و ناظر جان کر آنکھوں دیکھی سناتا ہوں۔ ایک دل زدہ اس حال میں حاضرِ خدمت ہوا کہ آنکھیں اس کی گنگا جمنا بنی ہوئی تھیں۔ پوچھا، یہ حال کیا بنایا ہے۔ کہا، قسمت نے یہ دن دکھایا ہے۔

پوچھا، گریہ کیوں کرتا ہے۔ بولا، یارِ عزیز یاد آتا ہے۔ پوچھا، کیا چاہتا ہے۔ بولا وصالِ یار۔ پہلے سمجھایا بجھایا، عشق کی تباہ کاریوں سے خبردار کیا جب دیکھا کہ دل کے ہاتھوں لاچار ہے تو ترس کھا کر کہا کہ مکڑی انار کی درکار

ہے۔ وہ ڈھونڈھ کر انار کی لکڑی لایا۔ آپ نے اس لکڑی کا قلم بنایا اور نقش ایک لکھ کر دیا کہ مینڈک کے منہ میں اسے رکھ اور مینڈک کو ندی کے کنارے داب۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ چالیس دن جب گذرے تو اس نے آکر پیر پکڑ لئے۔ حال پوچھا۔ کہا کہ بچھڑا یار مل گیا۔ دل کی مراد بر آئی۔

دوسرا واقعہ اس طرح ہے اور یہ بھی ان گنہگار آنکھوں کا دیکھا ہوا ہے۔ ایک عاشق باحال تباہ حاضر خدمت ہوا۔ فریاد کی کہ رقیب نے میری راہ میں کانٹے بوئے ہیں۔ یار کے کان میری طرف سے بھرے ہیں۔ اب وہ مجھ سے بدکا ہوا ہے۔ بیٹھے پہ ہاتھ نہیں رکھنے دیتا ہے۔ آپ نے کہا کہ چونتیس پتے آک کے لے کر آ۔ وہ بھاگا بھاگا جنگل گیا اور جھٹ پٹ چونتیس پتے آک کے توڑ لایا۔ آپ نے ان پتوں پر ببول کے کانٹے سے ایک نقش گودا۔ ہدایت کی کہ ٹیکا ٹیک دوپہری میں تندور گرم کرا اور یہ پتے اس میں جھونک دے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ پندھرواڑہ نہ گذرا تھا کہ رقیب روسیاہ ہوا۔ روٹھا یار من گیا۔

ایسے بہت سے واقعات ہیں، کہاں تک بیان کروں۔ اس در سے کبھی کسی حاجتمند کو نامراد واپس جاتے نہ دیکھا۔ نوع بہ نوع کے نسخے، عملیات، ٹوٹکے ان کے ناخنوں میں تھے۔ مشتے نمونہ از خروارے اکا دکا ٹوٹکا اور کوئی کوئی حکمت کی بات جو ذہن میں اٹکی رہ گئی ہے نقل کرتا ہوں۔

## دفینہ کیونکر نظر آوے

---

سیاہ تیتر پکڑ کر تین شب و روز اسے بھوکا رکھے چوتھے دن چونچ کھول کر پارہ بھر دے۔ پھر وہ پارہ نکال کر گائے کے دودھ میں پکائے اور تیتر کو کھلا دے جب وہ بیٹ کرے تب اس بیٹ کو آٹے میں ملا کر گولی بنائے اور منہ میں

رکھ لے۔ دفینہ اگر سات پردوں میں ہوگا تو بھی نظر آجائے گا۔

## ایضاً

کڑک ناتھ مرغے کی چربی حاصل کرے۔ واضح ہو کہ کڑک ناتھ مرغا بالکل سیاہ ہوتا ہے۔ اس کا گوشت بھی سیاہ ہوتا ہے۔ اس کی چربی حاصل کر کے آنکھوں میں لگائے۔ جہاں خزانہ دبا ہوگا نظر آجائے گا۔

## ایضاً

شبھ گھڑی میں کالی گائے کا دودھ اور مکھن ملا کر کڑک ناتھ مرغے کی زبان پر نکال لے۔ پھر وہ شخص جو اُلّو پیدا ہوا ہو اپنی آنکھوں میں لگائے۔ مال جہاں بھی گڑا ہوگا اسے دکھائی دینے لگے گا۔

## جیب خالی نہ ہونے کی ترکیب

اساڑھ کے مہینے میں سنیچر کے دن تالاب کے کنارے جا کر ایک جوڑا مینڈک کا جب وہ جفتی کھا رہا ہو پکڑے۔ نر کے منہ میں روپیہ رکھ کے تالاب کے ایک کنارے پورب کی سمت اور مادہ کے منہ میں اٹھنی رکھ کے تالاب کے دوسرے کنارے پچھم کی سمت گاڑ دے۔ یہ کام برہنہ ہو کر کرے بعد آٹھ دن کے کھود کر دیکھے۔ اگر روپیہ اُڑ کر اٹھنی کے پاس پہنچے تو روپے کو خرچ کرے اور اٹھنی کو پاس رکھ لے۔ اگر اٹھنی اُڑ کر روپے کے پاس پہنچے تو اٹھنی کو خرچ کرے اور روپے کو گرہ میں باندھ کر رکھے۔ انشاء اللہ جیب کبھی خالی نہ ہوگی۔

## طریقہ عمر کے معلوم کرنے کا

طریقہ عمر کے معلوم کرنے کا یہ ہے کہ اس گھڑی جب سورج نکل رہا ہو جنگل میں جائے۔ سورج کے رُخ آنکھیں موند کر سیدھا کھڑا ہے اور اپنی پرچھائیں کا خیال دل میں لائے۔ پھر آنکھیں کھول کر اپنی پرچھائیں کو دیکھے۔ اگر پوری ہے تو عمر دراز ہوگی۔ اگر سر غائب نظر آئے تو برس پورا نہ ہوگا کہ گذر جائے گا۔

## بیچ پھڑکنے اعضائے جسمانی کے

وہ گلفام خوش اندام زیر بحث نہیں جن کی بوٹی بوٹی پھڑکتی ہے۔ ان سے قطع نظر ہر آدمی کے اعضا وقتاً فوقتاً پھڑکتے ہیں۔ کسی عضو کا پھڑکنا اچھا ہوتا ہے۔ کسی کا بُرا۔ اگر ناک سیدھی طرف سے پھڑکے تو حاکم کی ناک کا بال بنے، زر و مال ملے۔ لب اگر اُوپر کا پھڑکے محبوب کا بوسہ ملے۔ اگر گلا پھڑکے غذائے لذیذ کھانے کو ملے و نیز فنِ موسیقی میں کمال حاصل کرے۔ اگر بغل سیدھی پھڑکے تو یار چلا جائے بغل خالی رہ جائے۔ اگر اُلٹی پھڑکے تو بچھڑا دوست بغل میں آئے۔ شاد کام ہو جائے۔ اگر ناف پھڑکے مرض میں مبتلا ہو۔ اگر زیر ناف پھڑکے تو دوست کی طرف سے صدمہ اُٹھائے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ ہمارے پھوپھا صاحب اپنے وقت کے بڑے عامل تھے۔ دعا میں اثر تھا۔ تعویز تیر بہدف ہوتا تھا اور تعویز کی چاروں اقسام خاکی، آبی، بادی، آتشی ان کے دائرہ اختیار میں تھیں۔ موکل قبضہ میں تھے۔ اور موکل بھی ایسے ویسے نہیں۔ ہماری پھوپھی اماں بیان کرتی تھیں کہ ان کے موکلوں میں زعفر جن کا پڑپوتا بھی تھا۔ میں نے ایک روز پھوپھی اماں کو اس باب میں کریدا تو یوں بیان فرمایا کہ بیٹے تمہارے پھوپھا صاحب کا یہ طور بندھا ہوا تھا کہ برس کے برس عاشورہ کے دن سیدانی بی کے

امام باڑے میں جا کے روضہ خوانی میں شریک ہوتے تھے۔ اس برس بھی ایسا ہی ہوا۔ روضہ خوانی ہو رہی تھی کہ اچانک لوگوں کی نظروں نے کیا دیکھا کہ قریب ہی ایک ناگ بل کھاتا ہے اور زمین پر پھن پٹختا ہے۔ دیکھنے والے دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے۔ تمہارے پھوپھا صاحب نے دیکھا تو قہر بھری نظروں سے اسے گھورا اور ڈانٹا کہ تو یہاں کیا کر رہا ہے ڈانٹ پڑتی تھی کہ ناگ غائب پھر جو دیکھا تو ایک لمبا تڑنگا آدمی سر جھکائے ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔ تمہارے پھوپھا صاحب نے ترش روئی سے پوچھا، یہاں کیا لینے آیا ہے۔ عاجزی سے بولا ثواب لینے۔ کہا اپنا حسب نسب بتا۔ بولا، زعفر جن کا پڑپوتا ہوں۔ ابنِ زعفر کہلاتا ہوں۔ عشقِ حسین ورثے میں ملا ہے۔ یہ سن کر تمہارے پھوپھا صاحب نرم پڑ گئے۔ بولے، پھر زہریلے کیوں بنے پھرتے ہو۔ زہر تھوکو، آدمی بنو اور ہمارے ساتھ رہو۔ اے لو وہ تو سچ مچ آدمی کی جون میں آ گیا اور تمہارے پھوپھا صاحب کی خدمت میں رہنے لگا۔ پتلی کنچے کی طرح چمکتی تھی۔ مگر گردش نہیں کرتی تھی۔ تمہارے پھوپھا صاحب نے کسی کام کو کہا۔ فوراً غائب۔ دم کے دم میں کام انجام دیا اور پھر حاضر۔

پھوپھا صاحب کی یہ سب کرامات اپنی جگہ۔ مگر ابا جانی کبھی ان کے قائل نہیں ہوئے وہ پھوپھا صاحب کے عملیات کو خلافِ اسلام جانتے تھے اور بدعت میں شمار کرتے تھے۔ مگر اس باعث کہ پھوپھا صاحب رشتہ میں بڑے تھے ان کے سامنے منہ نہیں کھولتے تھے۔ اصل میں پھوپھی اماں، ابا جانی سے عمر میں بڑی تھیں اور میاں جانی انہیں مانند اپنی والدہ کے جانتے تھے کہ ان کی والدہ ماجدہ یعنی راقم الحروف کی دادی حضرت ان کی کم عمری ہی میں دنیا سے سدھار گئی تھیں۔ پھر پھوپھی اماں ہی نے انہیں پال پوس کر بڑا کیا اور تربیت دی۔ یہ باعث تھا کہ پھوپھی اماں خاندان میں سب سے بڑی مانی جاتی تھیں۔ ان کے ہونٹوں سے نکلا حکم حاکم کی حیثیت رکھتا تھا۔

پھوپھی اماں واہ واہ سبحان اللہ کیا تال مکھانے کا سالن بناتی تھیں۔ باقی رہا قورمہ تو خدائے رازق قسم ہم نے پچھلے چالیس سال سے قورمہ نہ کھایا نہ آنکھ سے دیکھا۔ نہ وہ پکانے والے رہے نہ زعفران اور کیوڑہ خالص مہیا ہیں، پھر قورمہ کیسے تیار ہو اور چراغ حویلی سے تو قورمہ کا جنازہ اسی روز نکل گیا تھا جس روز پھوپھی اماں کی آنکھ بند ہوئی تھی۔ اب جو ہم قورمہ کھاتے ہیں تو قورمے کا منہ چڑاتے ہیں۔

ہاں پھوپھی حضرت جن دنوں لکھنؤ سے آجاتی تھیں، چراغ حویلی کے دسترخوان پر ایک نئی بہار آجاتی تھی۔ انناس کا مزعفر خوب۔ شش رنگا مرغوب، شش رنگے کی ایک رکابی میں چھ ذائقے سموئے جاتے تھے اور چھ رنگ چمک دکھاتے تھے۔ ارے اب ہم کیا کھاتے ہیں۔ خالی چپاتی۔ گوشت اور چپاتی بھی اب کہاں میسر ہے۔ وہ تو ہمارے میاں چپاتی کے ساتھ چلی گئی۔ کیا چپاتی پکاتے تھے۔ ہر چپاتی ہاتھی کے کان سے بڑی، ورق سے زیادہ پتلی کہ پوری چپاتی چٹکی میں آجائے۔ میاں چپاتی ابا جانی کے چہیتے باورچی تھے۔ میاں چپاتی کو بھی ان سے بہت لگاؤ تھا۔ جب ابا جانی کی آنکھ بند ہوئی تو ہم سے زیادہ میاں چپاتی روئے۔ ٹھنڈے سانس بھرتے تھے اور کہتے تھے کہ قدردان تو چلا گیا، اب میرے بنائے ہوئے پستہ کے سالن پر کون داد دے گا اور ہوائی چپاتی پر کون شاباشی دے گا۔ بس اسی غم میں باورچی خانے سے کنارہ کش ہو گئے اور چھ مہینے کے اندر اندر چٹ پٹ ہو گئے۔

حیف صد حیف کہ زمانہ بدل گیا اور ذائقے رخصت ہو گئے۔ تصور کیا چاہیئے کہ ہم کتنے ذائقوں کے ماتم دار ہیں۔ اب چراغ حویلی کے دسترخوان پر نہ پستے تال مکھانے کا سالن ہوتا ہے۔ نہ کیوڑے زعفران سے مہکتا ہوا قورمہ، نہ سلطانی دال، نہ اٹھارہ ورقی پراٹھے۔ نہ مزعفر متنجن نہ یاقوتی کی کلیاں نہ شش رنگے کی طشتریاں نہ زعفرانی سویاں۔ سب لذتیں نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں۔

لذتوں ذائقوں پہ کیا موقوف ہے۔ اس زمانے کا کونسا نقشہ اب باقی رہ گیا ہے۔ ابا جانی کا کیا اثر و رسوخ تھا۔ انہیں کے منہ سے فرنگی حاکموں نے اس ہیچ مقدرت کو خان بہادری کے خطاب سے نوازا۔ بعد میں آنے والے حاکموں نے بھی اپنے پیشروؤں کی وضع کو خوب نبھایا کہ جو کلکٹر بہادر اس ضلع میں تعینات ہوتے ہیں وہ اس بے بضاعت کو ضرور یاد کرتے ہیں۔ جب کبھی کلکٹر بہادر کا اس نواح میں ورود مسعود ہوتا ہے، حویلی کو مقرر اپنے قدوم میمنت لزوم سے زینت بخشتے ہیں اور کھانا تناول فرما کر حویلی کے دسترخوان کو عزت دیتے ہیں۔ مگر فقیر صاف صاف عرض کر دیتا ہے کہ یہ دسترخوان ابا جانی کے زمانے کا دسترخوان نہیں کہ پھوپھی اماں پھوپھی حضرت دونوں اس جہان سے سدھار گئیں اور میاں چپاتی بھی اللہ کو پیارے ہو گئے کہ اب جنت میں ٹکی لگاتے ہیں۔ پھر بھی کلکٹر بہادر ہونٹ چاٹتے جاتے ہیں اور دوبارہ آ کر کھانا تناول فرمانے کا وعدہ فرما کر رخصت ہوتے ہیں۔ موجودہ کلکٹر بہادر دام اقبالہٗ تو ہمارے دسترخوان کا کلمہ پڑھتے ہیں اور وقتاً فوقتاً قورمہ بریانی کی فرمائش کرتے ہیں۔ کاش انہوں نے ابا جانی کے زمانے کا دسترخوان دیکھا ہوتا۔

(قطع کلام ہوتا ہے۔ مگر مجھے اس ذکر سے اپنے گمشدہ ذائقے یاد آ گئے۔ بوجان اپنے بھلے وقت میں ماش کی دال بگھروا کیا خوب پکاتی تھیں کہ فرش پر بکھیر دو اور چاول کے دانوں کی طرح چن لو۔

"بوجان، کبھی آپ ماش کی دال بگھروا پکایا کرتی تھیں۔ اب تو زمانہ ہی ہو گیا وہ دال کھائے ہوئے۔"

بوجان نے میری بات بات سن کر ٹھنڈا سانس بھرا بولیں "بیٹے وہ بھلے وقتوں کی باتیں تھیں۔ اب ویسی دال پک نہیں سکتی۔"

"کیوں نہیں پک سکتی۔"

"بیٹے، وہ دال تو مٹی کی ہنڈیا میں پکا کرتی تھی"

"بوجان، مٹی کی ہنڈیا نایاب تو نہیں ہے۔ کل ہی لے آؤں گا"

"مٹی کی ہنڈیا تو لے آؤ گے۔ مگر میرے چاند مٹی کا چولہا کہاں سے مہیا کرو گے"

"مٹی کا چولہا" میں چکرایا "بوجان، مٹی کی ہنڈیا کی بات تو میری سمجھ میں آتی ہے۔ مگر مٹی کے چولہے کا فلسفہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ مطلب تو آنچ سے ہے۔ وہ گیس کے چولہے میں بھی ہوتی ہے"

"بیٹے آنچ اور آنچ میں بھی تو فرق ہوتا ہے۔ جری لکڑیوں کی دھیمی آنچ پہ پک کر ہنڈیا کا جو مزہ نکلتا تھا وہ تمہارے گیس کے چولہوں پہ پکی ہوئی ہنڈیا کا نہیں نکل سکتا"

شاید یہی احساس تھا کہ بوجان رفتہ رفتہ باورچی خانے سے بالکل ہی بے تعلق ہو گئی تھیں۔ زبیدہ نے پکا کر جو سامنے رکھ دیا اسے بلا تبصرہ کھا لیا۔ نہ تعریف نہ تنقیص۔ آشیانے کے کچن میں جہاں زبیدہ نے بڑے ذوق و شوق سے گیس کے چولہے بازار سے منگا کر فٹ کیے تھے۔ بوجان نے بس ایک دفعہ قدم رکھا اور ان چولہوں کو اور ان پر چڑھے پریشر ککر کو دیکھ کر الٹے پیروں واپس ہو گئیں۔ بوجان جو کچھ بھی تھیں "چراغ حویلی" کے باورچی خانے میں تھیں۔ کتنی مگن رہتی تھیں، دھوئیں سے بھرے اس بڑے باورچی خانے میں ـ ـ ـ ـ جہاں بڑے بڑے مٹی کے چولہوں میں ہر دم موٹی موٹی لکڑیاں سلگتی رہتی تھیں اور ہر دم کوئی نہ کوئی ہنڈیا ان پر چڑھی ہی رہتی تھی۔ میں نے جب ہوش سنبھالا تو وہ رنگا رنگ دسترخوان جس کا میاں جان نے ذکر کیا، لپٹ چکا تھا۔ میاں جان کی پھوپھی اماں اور پھوپھی حضرت دونوں اللہ کو پیاری ہو چکی تھیں، ان کے ابا جانی سدھار چکے تھے اور میاں چچا جانی بھی منوں مٹی تلے جا سوئے تھے۔ اب وہ باورچی خانہ بوجان کی قلمرو تھا۔ خیر؛

ابا جانی خود تو دو لقموں میں سیر ہو جاتے تھے۔ کھاتے کیا تھے، سونگھتے تھے۔ دسترخوان

تو اصل میں مہمانانِ عزیز اور یارانِ باتمیز کے لئے بچھتا تھا۔ جہاں اور وضعداریاں تھیں۔ ایک وضعداری یہ بھی تھی۔ ابا جانی کی وضعداری کا عالم تو یہ تھا کہ کہیں ایک دفعہ پھوپھی حضرت اور پھوپھا حضور کو ماہِ محرم میں ادھر آنا پڑ گیا۔ محض ان کی خاطر ابا جانی نے ایک مجلس کا اہتمام کیا۔ اگلا برس جب آیا اور وہ تاریخ قریب آئی تو اپنی وضع کا پاس کرتے ہوئے پھر مجلس کا اہتمام کیا۔ بس پھر وہ مجلس ہر برس ہونے لگی۔ اگرچہ خود ابا جانی گریہ اور ماتم کے قائل نہیں تھے۔ گریہ کا فریضہ ان کی طرف سے اس مجلس میں پنڈت سوم دت آنجہانی ادا کرتے تھے۔ کس اہتمام کے ساتھ دو رومال لے کر مجلس میں آتے تھے۔ اِدھر مصائب شروع ہوئے اِدھر اُن کی آنکھوں سے آنسوؤں کی گنگا بہنے لگی۔ جب ایک رومال آنسوؤں سے شرابور ہو جاتا تو دوسرا رومال نکال لیتے۔ مجلس کے ختم پر دونوں رومال آنسوؤں سے تر بتر ہوتے

اپنا پنڈت گنگا دت اس بزرگ کی اکلوتی اولاد تھی۔ مجھے یاد ہے کہ بیٹے کو ان کی ایک ہی نصیحت تھی "بیٹے گلہری بن گلہری۔ اسی میں تیرا کلیان ہے"

میں اس نصیحت پر بارہا چکرایا۔ ایک روز جسارت کر کے اس ہیچمداں نے پوچھا کہ "پنڈت چچا، گلہری بننے میں کیا بھید ہے"

تب اس بزرگ نے یوں فرمایا "بھتیجے، یہ تب کی بات ہے جب ہمارے سری رامچندر جی لنکا میں پہنچنے کے لئے سمندر پہ پٹی باندھ رہے تھے۔ ہنومان جی کی سینا پتھر ڈھونے پر لگی ہوئی تھی۔ ادھر سے ایک گلہری کا گذر ہوا۔ اسے اچنبھا ہوئی کہ آج یہاں کیا ہو رہا ہے۔ پوچھ گچھ کی تو پتہ چلا کہ سری رامچندر جی کی آگیا سے یاں پہ پل بن رہا ہے۔ اس نے سوچا کہ اس کام میں مجھے بھی بھگوان کی سہائتا کرنی چاہیئے۔ اس نے یہ کیا کہ منہ میں ایک کنکری دبائی اور پتھر ڈھونے والے بندروں کے ساتھ ساتھ چلی۔ جہاں انہوں نے پتھر ڈالے وہاں اس نے یہ کنکری ڈال دی۔ دیر تک وہ یہی کرتی رہی۔ بندر اسے دیکھ کے ہنسے۔ ایک بندر نے اسے اٹھا کر الگ پھینک دیا۔ کہا کہ پرے ہٹ: ہمیں کام کرنے دے۔ گلہری بلبلائی

کرنے لگی۔ سری رامچندر جی نے یہ دیکھا تو اسے اُٹھا کر پیار سے گود میں بٹھالیا۔ بندروں سے کہا کہ ہے بھلے بندرو۔ جو تمہارے بس میں ہے تم کر رہے ہو۔ جو گلہری کے بس میں ہے۔ گلہری کر رہی ہے۔ سو اس کا اپمان مت کرو۔ یہ کہہ کے انہوں نے شفقت سے گلہری کی پیٹھ پہ ہاتھ پھیرا۔ بھگوان کی شفقت بھری انگلیوں کے نشان آج بھی گلہری کی پیٹھ پہ موجود ہیں"۔

پنڈت سوم دت آنجہانی رامائن کا پاٹھ کس استغراق سے کرتے تھے۔ رامائن ان کے ناخنوں میں تھی۔ گلستان انہیں ازبر تھی۔ پوجا پاٹ کتنے خضوع و خشوع سے کرتے تھے۔ پیشانی پہ کتنا لمبا تلک لگاتے تھے۔ عید پر انگرکھا زیب تن کر کے مقرر آتے۔ ابا جانی سے بغل گیر ہوتے، میرے سر پہ شفقت سے ہاتھ پھیرتے اور عیدی عطا کرتے۔ اسی وضعداری سے ابا جانی ہولی دیوالی پر ان کے یہاں جاتے۔ پنڈت گنگا دت وضع احتیاط برتتے۔ ابا جانی کے روئے مبارک کو نہ تو گلال سے الودہ کرتے نہ رنگ ڈالتے کہ ابا جانی تو ان مشاغل کو خرافات جانتے تھے اور ہندو رسوم کو شرک سے تعبیر کرتے تھے مگر دوستوں کے دوست تھے اور وضع کے پابند تھے۔ سو ہولی دیوالی پر دوست کے یہاں جانا ضرور تھا۔ تھالی میں سے ایک الائچی اور تھوڑی سونف اُٹھا کر منہ میں رکھ لیتے۔ لیجئے دوست کے تیوہار میں شریک ہو گئے۔ پنڈت سوم دت باپ کی کسر بیٹے کے ساتھ نکالتے۔ میرے منہ پہ اتنا گلال ملتے کہ میں بندر بن جاتا۔ پھر گنگا دت پچکاری چلا کے مجھے ٹیسو رنگ میں شرابور کر دیتا۔ ابا جانی سونف الائچی چباتے رہتے اور خاموش رہتے۔ دوست کی اس روش پر کبھی معترض نہیں ہوئے۔ اللہ اللہ کیا رواداری تھی اور کیا وضعداریاں تھیں۔

ابا جانی اس دارفانی میں اسی برس جیئے۔ سفرِ حیات گلستان محل سے شروع ہوا اور چراغ حویلی میں آکر انجام پذیر ہوا۔ پوری زندگی راہِ اعتدال پر گامزن رہے۔

جو روش ایک دفعہ پکڑ لی اس سے کبھی انحراف نہیں کیا۔ صبح منہ اندھیرے تاروں کی چھاؤں میں اُٹھنا، مگدر ہلانا، تازہ پانی سے غسل کرنا اور فجر کی نماز پڑھنا۔ فجر کی نماز کے بعد ناشتہ کہ شہد باسی روٹی اور عرقِ مارالملم سے عبارت تھا۔ پھر مطب کرنا۔ جاڑے گرمی برسات وہی ایک طور، حتیٰ کہ کبھی لباس میں بھی فرق نہیں دیکھا گیا۔ لٹھے کا چوڑی دار پائجامہ، ململ کا کرتا، چکن کا انگرکھا کہ گرمیوں میں پہنتے تھے۔ بہاوٹ کے جاڑوں میں بھی زیبِ تن کئے رہتے تھے۔ مگر کیا صحت تھی کہ بخار جاڑا کیا معنی کبھی چھینک بھی نہیں آئی۔ بتیسی آخر وقت تک سلامت رہی اور پتلی آنکھ کی آنکھ بند ہونے تک روشن رہی۔

ابا جانی نے فکر و پریشانی کو کبھی قریب نہیں پھٹکنے دیا۔ آخری عمر میں بس ایک ملال دامن گیر ہو گیا تھا کہ ان کے اُٹھ جانے کے بعد خاندانی مسند حکمت پر کون بیٹھے گا۔ کف افسوس ملتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم نے صاحبزادوں کو علی گڑھ بھیج کر کتنی رکعت کا ثواب کمایا۔ ایک صاحبزادے دین سے بیگانہ ہو گئے۔ دوسرے صاحبزادے نے فرنگی کی چاکری کر لی۔

ابا جانی بس ایک ملال دل پر دھر کر لے گئے۔ مگر اس کے باوصف آخری گھڑیوں میں بہت پُرسکون نظر آتے تھے۔ کس سادگی سے پردہ کیا کہ لیٹے لیٹے ایک ہچکی لی اور آنکھیں موند لیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

فرزندِ اکبر ہونے کی بنا پر اس خاکسار ہی نے ابا جانی کو قبر میں اُتارنے کا شرف حاصل کیا۔ جب میں قبر میں اُترا تو خدا کو حاضر و ناظر جان کر عرض کرتا ہوں کہ قبر خوشبو سے مہک رہی تھی اور جب ابا جانی کا جسدِ مبارک میرے ہاتھوں میں آیا تو وہ پھول کی مثال ہلکا تھا۔ میں حیران کہ یا الٰہی ابا جانی تو دہرے بدن کے تھے۔ کاٹھی بنی ہوئی تھی اور اس گھڑی اتنے سُبک ہیں کہ جیسے آدمی کی لاش نہ ہو پھولوں کی ڈالی ہو۔